سید کامران عباس کاظمی
لیکچرر، شعبہ اُردو
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

منٹو بحیثیت فلمی نقاد: تجزیاتی مطالعہ

Manto was a multidimensional litterateur . He wrote not only short stories but he was a prominent critic of Urdu Cinema movies as well of that era. His criticism was all about the story, role of characters, and technique. In this essay Manto's writings about Cinema movies are academically discussed .

منٹو کے مضامین میں شامل فلمی موضوعات پر لکھے گئے مضامین اہمیت کے حامل ہیں۔منٹو کے پہلے دورِ مضمون نگاری میں دو مضمون فلم کے موضوعات کے حوالے سے انتہائی اہم ہیں۔ان میں سے ایک ''ہندوستانی صنعت فلم سازی پر ایک نظر''اور دوسرا ''زندگی'' جواسی نام سے بنی فلم پر تبصرہ ہے۔

فلم کا میڈیا اُنہی دنوں میں ہندوستان میں نیا نیا متعارف ہوا تھا اور آغاز میں غیر متکلم فلمیں بننا شروع ہوئی تھیں لیکن جلد ہی متکلم فلموں کا دور شروع ہوگیا۔منٹو جب فلمی صنعت سے وابستہ ہوے تو متکلم فلمیں بن رہی تھیں۔ ہندوستانی فلموں کا مرکز بمبئ تھا۔ منٹو ہفتہ وار ''مصور'' کی ادارت سنبھالنے کے لیے۱۹۳۵ء میں بمبئ آئے۔'' مصور'' فلمی رسالہ تھا اور اس رسالے کے صفحات کے ذریعے منٹو نے اپنے بے لاگ تبصروں سے فلمی صحافت میں ایک نیا باب رقم کیا اور بطور فلمی نقاد کے اپنی حیثیت تسلیم کروالی۔''ہفت روزہ مصور بمبئ کی فلمی صحافت کے لیے مشعل راہ ثابت ہوا۔''[۱] جلد ہی منٹو امپیریل فلم کمپنی میں نذیر لدھیانوی کے توسط سے بطور 'منشی' ملازم ہو گئے۔ایک فلمی رسالے کی ادارت اور پھر فلمی زندگی سے بالواسطہ تعلق نے ہی منٹو کو فلمی موضوعات ،تکنیک اور اس جدید میڈیا کے مناسب استعمال کے بارے میں سمجھنے میں مدد دی۔اس عرصہ میں منٹو نے فلمی موضوعات پر دو اہم مضامین قلمبند کیے۔ دراصل منٹو ان لوگوں سے ذہنی مناسبت پیدا نہ کر سکے جو فلم کی دنیا میں اربابِ اختیار تھے۔اس کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً کرتے رہے حالانکہ وہ فلمی کمپنیوں میں ابھی معمولی ملازم تھے۔بے خوفی اور بے باکی سے حقائق کو سامنے لے آنا منٹو کی سرشت میں شامل تھا۔ منٹو فلمی صنعت سے وابستہ افراد کے خلوص اور لگن کو سمجھ گئے تھے۔انھیں اس بات کا احساس ہوگیا کہ یہاں صرف دولت کمانا ہی سب کا مقصد ہے اور فلمی فن سے کسی کو کوئی واسطہ نہیں اور نہ یہاں اچھے لکھنے والوں کی کوئی قدر ہے۔''ہندوستانی صنعت فلم سازی پر ایک نظر''،فلمی صنعت کا استعمال اور اس کی افادیت پر منٹو کے قلم سے نکلا ہوا بہت اہم مضمون ہے۔ہندوستان میں فلم سازی کی صنعت کیوں ترقی نہیں کر رہی؟جن لوگوں کے پاس کام کرنے کا ولولہ ہے،جوش ہے۔لیکن اُنہیں کام کیوں نہیں کرنے دیا جاتا؟ جبکہ ہندوستان کو ایسی اچھی فلموں کی ضرورت ہے جنہیں بین الاقوامی معیار حاصل ہو۔ ایسے دیگر سوالات اس مضمون کا حصہ ہیں۔دو

نسلوں کے درمیان موجود تضاد دراصل دونظریوں کا تضاد بن چکا تھا۔منٹو کا خیال ہے کہ''کسی صنعت کو بام رفعت تک پہنچانے کے لیے ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں ہوتی،جن کا تخیل زنگ آلود اور جن کی زندگی ٹھہرا پانی بن کر رہ گیا ہو۔''[۲] ایسا جذبہ صرف نوجوانوں کے پاس ہوتا ہے جو کچھ کر دکھانا چاہتے ہیں وہ اس صنعت کی ترقی سے مطمئن نہیں ہیں۔لیکن سرمایہ دار کی ساری توجہ اپنی تجوریاں بھرنے پر مرکوز رہتی ہے سو وہ ان ترقی پسند نوجوانوں کے دیوانہ پن سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ درست ہے کہ قوموں کی تقدیر اسی نوجوان طبقہ نے بدلنی ہوتی ہے جسے ہندوستان میں تبدیلی پیدا کرنے سے روکا جاتا رہا ہے۔منٹو انقلاب روس کو ایسا پڑاؤ سمجھتے ہیں جس نے روسی ادب کو بھی بام عروج بخشا اور''صنعت فلم سازی میں بھی اُن کی ترقی قابل رشک ہے۔روس نے ایسے ایسے ڈائریکٹر پیدا کیے ہیں کہ اُن پر فکر انسان ہمیشہ بجا طور پر نازاں رہے گا۔''[۳]

ہندوستانی صنعت فلم سازی کے ۵۲سالوں میں کیا ترقی ہوئی؟اس ترقی معکوس کا ذمہ دار کون ہے؟منٹو ایسے تخلیق کاروں کو ہدف ملامت بناتے ہیں جو کسی نئے خیال کو فلمانے کے بجائے دوسروں کی چچوڑی ہوئی ہڈیاں پیش کرتے ہیں۔ یقیناً ایسی فلمیں بین الاقوامی میعار کی حامل نہیں ہوسکتیں جو اچھی امریکی فلموں کی نقل ہیں اور نقل بھی ایسی کہ''جو امریکی فلموں کی ہزارویں کاربن کاپی معلوم ہوتی ہیں۔''[۴] فلم کو کیسا ہونا چاہیے؟اس اہم سوال کا جواب منٹو کے خیال میں یوں ہے۔ہندوستان میں ٹھیٹ ہندوستانی فلم بننی چاہیے۔ہماری وہ سوشل فلم جو آج کل سینکڑوں کی تعداد میں سینماؤں کے پردوں پر چلتی ہیں کیا ہندوستانی تہذیب کی آئینہ دار ہیں؟''[۵] فلم جسے اپنی تہذیب و معاشرت کا عکاس ہونا چاہیے وہ یقیناً ہندوستانی فلم کسی صورت نہیں ہے۔ بلکہ ان فلموں کی صورتحال کافی مضحکہ خیز ہے کہ یہاں ہندوستانیت امریکی لباس میں اور امریکہ دھوتی کرتے میں نظر آتا ہے۔منٹو کا خیال ہے فلمی صنعت کو زوال کا شکار کرنے کے پیچھے کسی سنجیدہ مقصد کا نہ ہونا اور نقالی کرنے کا رجحان کارفرما ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ''آرٹ'' کے درست معنی متعین نہیں ہو سکے۔آرٹسٹ اور شاہکار کیا ہوتے ہیں؟ان دولفظوں کو بے دریغ استعمال کیا گیا ہے اور اِن کا کوئی معیار نہیں رہنے دیا گیا:

ہندوستانی صنعت فلم سازی میں جن دولفظوں کے ساتھ بہت برا سلوک ہوتا ہے۔ان میں ایک آرٹسٹ ہے اور دوسرا شاہکار ۔ڈائریکٹر سے لے کر اسٹوڈیو میں تختے ٹھونکنے والے مزدور تک سب کے سب آرٹسٹ ہیں۔''ہریش چندر'' سے لے کر''ستارہ'' تک جتنی فلمیں بنی ہیں،سب کی سب شاہکار ہیں۔اس سے یہ ہوا کہ آرٹ اپنی قدر و منزلت کھو بیٹھا ہے اور شاہکار شاہکار نہیں رہا۔[۶]

فلم کو زوال آشنا کرنے میں جہاں کہانی نویس،ڈائریکٹر یا دیگر ذمہ دار ہیں وہیں فلمی صحافت بھی ذمہ دار ہے۔ ایسے صحافی بھی موجود ہیں جو پروڈیوسر کی خواہش کا احترام کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور یہ بھی اس زوال میں برابر کے شریک ہیں۔یقیناً ایسی صحافت کبھی بھی اپنے منصب کی ادائیگی نہیں کر سکے گی جو صحافی کے ذاتی منفعت کے لیے استعمال ہو۔سینکڑوں اخبارات و رسائل کے باجود صحافت نے ابھی ہندوستان میں اپنی فطری شکل اختیار نہیں کی تھی لیکن جب عوام باشعور ہوں گے ان پر علم و دانش کی درسگاہوں کے دروازے کھل جائیں گے تو صحافت بھی اپنا فطری کردارادا کرنے کے قابل ہو سکے گی۔منٹو فلم کے میڈیا کے پر اثر ہونے اور اس کی اہمیت سے آگاہ تھے۔اُن کا کہنا ہے کہ''عوام کو تعلیم یافتہ بنانے کے مختلف طریقے ہیں۔ان سب میں فلم کو متفقہ طور پر بہت بااثر تسلیم کیا گیا ہے۔''[۷] نصاب کے بھاری بھرکم بستوں سے جو کچھ طلبا کو نہیں سمجھایا جاسکتا وہی بات ایک فلم کے ذریعے

ذہن نشین کرائی جاسکتی ہے۔ اس سے یہ مراد قطعاً نہیں کہ فلم نصاب کا نعم البدل ہے بلکہ فلم کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے اثرات ہمہ گیر ہوتے ہیں۔منٹو نے اس بات کا ادراک کرلیا تھا کہ فلم سے ہندوستانی اذہان کو بدلا جاسکتا ہے اور انہیں صحت مند خطوط یا ڈگر پر ڈالا جاسکتا ہے۔فلم کا مقصد محض تفریح فراہم کرنا نہیں ہے اور نہ اس سے لوگوں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈال کر اپنی تجوریاں بھرنے کا کام لیا جانا چاہیے بلکہ اس کے باقی مثبت پہلوؤں کو برسرکارلایا جائے۔منٹو کا خیال ہے کہ تیسرے درجے کی لچر فلمیں اس لیے بنائی جاتی ہیں کہ فلم بین انہیں پسند کرتے ہیں یا پھر پروڈیوسر کا خیال ہے کہ یہ عوام کے مزاج کے مطابق ہوتی ہیں۔منٹو اس بات کو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں۔اُن کا کہنا ہے ''مزاج پیدا کیا جاتا ہے،خود پیدا نہیں ہوتا۔اگر پبلک میں پست مزاج کے لوگ موجود ہیں تو اس کے ذمہ دار ہمارے پروڈیوسر ہیں جو مزاج کو پستی کی طرف لے جاتے ہیں۔''[۸]

منٹو نے فلم کی تکنیک سے بھی بحث کی ہے۔وہ ہندوستانی فلموں کی غیر ضروری طوالت کو فلم کا نقص سمجھتے ہیں اور اس طوالت کو ہی وہ فلم کی ناکامی کی وجہ قرار دیتے ہیں کیونکہ ایسی طویل فلمیں جہاں فلمی صنعت پر بوجھ کا سبب بنتی ہیں وہیں وہ تماشائیوں کے اذہان پر بھی برا اثر ڈالتی ہیں۔منٹو ہمیشہ اختصار کے قائل رہے ہیں۔اس بارے میں اُن کا نظریۂ ادب بہت واضح ہے۔اگر مناسب طوالت کی حامل فلم کو غیر ضروری طور پر طویل کیا جائے گا تو نتیجے میں مکالمے طویل کرنا ہوں گے۔فلم کے واقعات اور حادثات طویل ہوں گے اسی طرح سیٹ طویل ہوں گے غیر ضروری طور پر یا موقع بے موقع ناچ گانا شامل کرنا ہوگا اور اس سب کے باعث ''فلم کی رفتار میں لنگڑا پن پیدا ہو جائے گا جو آنکھوں کو بہت برا معلوم ہوگا۔''[۹] طویل فلم کے اخراجات بھی بڑھ جائیں گے۔جس کے باعث فلم میں روپیہ لگانے والوں کی دلچسپی کم ہو جائے گی۔فلم کے مؤثر ہونے اور جدید میڈیا سے لوگوں کی ہم آہنگی کے باعث منٹو کی دوررس نگاہیں طویل فلموں کے نفسیاتی پہلوؤں کو شناخت کر لیتی ہیں اور اسے عوام یا فلم بینوں کے لیے مضر خیال کرتے ہوئے وہ طوالت پسندی کو تنزل کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں۔منٹو اس ضمن میں ہالی ووڈ کی فلموں کو قابل تقلید سمجھتے ہیں۔منٹو کے عہد میں ابھی ہندوستان میں ٹیلی ویژن عام نہیں ہوا تھا اسی لیے وہ مشورہ دیتے ہیں کہ فلم کو طویل کرنے کے بجائے یورپ کی طرح فلم کے بعد یا دوران فلم کچھ بین الاقوامی یا ملکی خبروں اور دیگر دلچسپ چیزوں کے متعلق بھی فلم چلائی جاسکتی ہے تاکہ ناظرین فلم کے ساتھ ساتھ دوسرے ممالک کے تازہ ترین واقعات و حالات سے بھی آگاہ ہوسکیں۔

اسی مضمون میں منٹو ''ستارہ یا ستارہ شناس'' کے عنوان سے اس امر کو بھی زیر بحث لاتے ہیں کہ فلم میں اسٹار کو زیادہ اہمیت حاصل ہے یا خود فلم کو۔مختلف مغربی ماہرین فن کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں ''تجربے سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ فلم ستارہ ساز ہے اور ستارے کمزور فلم کو تابانی نہیں بخش سکتے۔''[۱۰] ہندوستانی فلموں کی ایک بدقسمتی یہ بھی ہے کہ صنعت فلم سازی کے آغاز سے ہی قحبہ خانے،تھیٹر اور چھچلے اداکارائیں مہیا کیا کرتے تھے۔ پڑھے لکھے طبقے سے جب تک فلم کے ستارے نہیں لیے جائیں گے اس زوال کو تب تک عروج میں نہیں بدلا جاسکتا۔اچھی کاسٹ کبھی بھی کمزور کہانی کو اچھی فلم میں نہیں بدل سکتی۔منٹو فلم میں کردار نگاری کو بہت اہم سمجھتے ہیں اور اس بات کو بھی اہمیت دیتے ہیں کہ موزوں و مناسب کاسٹ ستارے بناتی ہے۔ایک فلم کی کامیابی میں اُس کے تمام کل پرزوں کا اچھی حالت میں کام کرنا بہت ضروری ہے۔یعنی ایک ہدایت کار سے لے کر ایک ٹیکنیشن تک سبھی فلم کو ناظرین تک پہنچانے میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

فلموں کی کامیابی اورفلموں کے ستارے پیدا کرنے میں دراصل ستارہ شناس نگاہیں بہت ضروری ہوتی ہیں اور یہ ستارہ شناس نگاہیں اہل طرز ڈائریکٹر کی ہوتی ہیں۔منٹو ہندوستانی فلموں کے زوال کی وجوہات گنواتے ہوئے ایک وجہ اہل طرز ڈائریکٹروں کی کمی بھی سمجھتے ہیں ۔منٹوفلم کے ہدایت کار کے صاحب اسلوب ہونے کی اہمیت سے آگاہ ہیں۔ان کا یہ کہنا اہمیت کا حامل ہے کہ''اگر ڈائریکٹروں کا اپنااپنا اسٹائل نہ ہوگا تو فلم متحرک تصاویر کے یک آہنگ فیتے بن کر رہ جائیں گے۔''[۱۱] منفرد اسلوب سے عاری ہدایت کارفلم کوفلم نہیں بناسکتے۔منٹوجن ہدایت کاروں کومنفرد اسلوب کا حامل سمجھتے ہیں اُن میں''ارنسٹ کیوبش''،''ڈی ڈبلیوگرفتھ''، ''ایرک خان مسٹراہیم'' اور ہندوستانی ہدایت کاروں میں''دیوکی باس'' اور''شانتا رام''امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔اسی مضمون میں منٹواداکاری کےفن پر خاص طور پر اظہار خیال کرتے ہیں۔منٹوکردار نگاری کی تعریف یوں کرتے ہے''ایکٹنگ یا کردار نگاری اس فن کا نام ہے جس کے ذریعے سے مختلف انسانوں کے جذبات ومحسوسات کا اظہار کیا جاتا ہے۔''[۱۲]کردار نگاری کی یہ جامع تعریف ہے۔منٹو اداکاری کوبھی مصوری،شاعری،سنگ تراشی،افسانہ نویسی اور موسیقی کی طرح فنونِ لطیفہ میں شمار کرتے ہیں۔کردار نگاری کا فن تو انسان کے ساتھ ہی پیدا ہوا۔جب اُس نے دوسروں کی نقل کی اور کامیاب نقل ہی اداکاری کہلائی۔لیکن ایک اداکارفلم میں یہ کام کچھ پابندیوں کے ساتھ انجام دیتا ہے۔اُس کے لیے اسٹیج کا منظر، کیمرہ کی پوزیشن ، روشنی کی سمت اور اس طرح کی دیگر پابندیاں ضروری ہوتی ہیں۔یعنی اداکاری کے لیےبھی کچھ تیکنیکی پابندیوں کا خیال رکھنا بھی لازمی امر ہے۔

منٹو کا خیال ہے کہ ہندوستان میں کرداروں کی تلاش نہیں کی جاتی جو ذراسا اچھا گلا رکھتا ہو، ذرا مناسب شکل وصورت کا مالک ہواسے اداکاری کے لیےمناسب سمجھ لیا جاتا ہے۔ہالی ووڈ،جوفلموں کا باوا آدم ہے، کا انداز ہی صنعت فلم سازی کےفروغ کے لیے معاون ہوسکتا ہے۔وہاں کسی مخصوص کردار کے لیے افراد کا چناؤ کیا جاتا ہے کافی چھان بین کے بعد اُنہیں اداکاری کے لیے مناسب سمجھا جاتا ہے۔جبکہ ہندوستان میں اس صنعت کے ترقی نہ کرنے کی بنیادی وجہ مناسب اداکاروں کی تلاش اور تربیت کا فقدان ہے۔منٹو اچھی اداکاری کے لیے ریاض اورلگن کوضروری خیال کرتے ہیں۔اسی مضمون کا ایک ذیلی موضوع ہے''فلموں کا سادھو'' سادھو دراصل ہندوستان کی تہذیب کا ایسا کردار ہے جوگلی کوچوں میں اشلوک یا گیت اورمسلمان ہونے کی صورت میں حمد و نعت گاکراناج مانگتا ہے۔عموماًاس کا تصور ایسے شخص سے کیا جاتا ہے جو دنیاسے لاتعلق ہو۔سادھوکاحقیقی دنیا سے گہراتعلق ہےمگرمنٹو کے خیال میں اسے بھی فلم میں غیرضروری طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔منٹواس سادھو کی موجودگی کو اداکاری کی خامی سمجھتے ہیں۔یعنی اگر اداکارہ اداس ہے تو اُس کی اداکاری کو واضح کرنا چاہیے کہ وہ اداس ہے نہ کہ شہر کے بھکاری یہ خبر دوسروں تک پہنچائیں۔منٹو اسے سینمائی اصولوں کے خلاف قرار دیتے ہیں ۔فلم کے ہدایت کاروں کا یہی ذہنی افلاس ہے کہ وہ فلموں میں انفرادیت نہیں پیدا کر سکے اور نہ کوئی نئی بات پیدا کرسکنے کے قابل ہیں۔اگرکسی ایک آدھ فلم میں سادھو کا کردار چل گیا ہے تواب سارے ہی لکیر پیٹتے جائیں گے۔کچھ ایسی ہی صورتحال فلموں کے ہیرو اور ولن کے ساتھ بھی درپیش ہوتی ہے۔یورپ کی ابتدائی فلموں کی طرح ہمارے ہاں ابھی تک وہی تثلیث دہرائی جاتی ہے یعنی ہیرو، ہیروئن اور ولن۔ اس طرح ہندوستانی فلموں میں کہیں بھی ندرت کا احساس نہیں ہوتا۔ ہیرو، ہیروئن اور ولن پرمشتمل کہانی کومنٹو بدعت قرار دیتے ہیں۔ہماری فلم میں ہیرو اور ولن کوخیر اور شر کا بالترتیب نمائندہ تصور کیا جاتا ہے گویا ایک کردار میں دوسرے کردار کا کوئی عنصر نہیں ملے گا۔کیا ایسے انسان کہیں موجود ہیں؟ فلم میں ہیرو، ہیروئن اور ولن کی تثلیث اہم ہےمگرمنٹوان میں انسانی خوبیوں اور خامیوں پر زور دیتے ہیں۔وہ ایسے کرداروں کی توقع رکھتے ہیں کہ جنھیں دیکھتے

ہی یہ احساس پیدا نہ ہو کہ وہ صرف اچھائی یا صرف برائی کے کردار ہیں یعنی جو صرف فرشتے یا شیطان نہ ہوں بلکہ دونوں ہوں اور اُن کا تعلق حقیقی دنیا سے ہو۔

فلم کی تکنیک اور ہندوستانی فلموں کے زوال کے اسباب کے بارے میں منٹو کا یہ مضمون بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس مضمون میں منٹو نے تقریباً فلم سے متعلق تمام موضوعات کا بخوبی احاطہ کیا ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی منٹو کے اس مضمون کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں۔ ’’منٹو کا یہ مضمون صنعت فلم سازی کے ایسے پہلو سامنے لاتا ہے جن کی صداقت میں آج اتنے سال گزرنے کے بعد بھی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔‘‘[۱۳]

فلموں میں خواتین کرداروں یا اداکاروں کے حوالے سے ایک مضمون بعنوان ’’شریف عورتیں اور فلمی دنیا‘‘ بھی منٹو کے پہلے دور مضمون نگاری میں ہی لکھا گیا تھا۔ ہندوستانی صنعت فلم سازی میں ابتدا میں خواتین کردار عموماً تھیٹر یا قحبہ خانوں سے لیے گئے تھے۔ اُنھیں اداکاری کی کوئی تربیت نہ تھی۔ فلم میں کام کرنے کی واحد خوبی اُن کے چہرے کا حسین ہونا تھا جبکہ رقص میں مہارت اضافی خوبی تصور کی جاتی تھی۔ اس مضمون کا بنیادی مقصد فلم میں جذبات نگاری ہے۔ حقیقی جذبات نگاری، منٹو کے نقطۂ نظر میں صرف وہی شخص کرسکتا ہے جو اُس طرح کی صورتحال سے زندگی میں دوچار ہوا ہو یا اُس سے آگاہ ہو۔ ذیل کا اقتباس دیکھیے:

جذبات نگاری اور ایکٹنگ کے لیے ایکٹر اور ایکٹرس کو دنیا کے بیشتر نشیب و فراز سے آگاہ ہونا ازبس ضروری ہے کوئی شریف عورت کیمرے کے سامنے اپنے فرضی عاشق کی جدائی کے اثرات اپنے چہرے پر پیدا نہیں کرسکتی جب تک وہ اسی قسم کے حادثے سے پہلے دوچار نہ ہو چکی ہو جو عورت غم سے ناآشنا ہے وہ غم کے اثرات خود پر کس طرح طاری کرسکتی ہے؟[۱۴]

ایکٹرس کا کام اپنے کردار سے انصاف کرنا ہوتا ہے۔ گناہ یا ثواب کا انسان کی ذات سے تعلق ہوتا ہے اُس کا فن سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جب ہماری نظر فنکار کے فن پر ہوگی تو اس بات کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا کہ ایکٹرس سماج کے کس گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔

فلم کی تکنیک کے اسرار و رموز کے حوالے سے کسی فلم پر عملی تنقید کا ایک اچھا نمونہ منٹو اپنے مضمون ’’زندگی‘‘ میں پیش کرتے ہیں۔ مضمون کا آغاز منٹو کی اختراع کردہ ایک نثری نظم اور اُس پر کی جانے والی خوبصورت تنقید سے ہوتا ہے۔ منٹو بنیادی طور پر نقاد نہیں تھے لیکن بطور فنکار اُن کے مضامین سے اُن کے تنقیدی شعور کا واضح اندازہ ہوتا ہے۔ ’’زندگی‘‘ منٹو کے قیام بمبئی میں بننے والی مشہور فلم تھی۔ وارث علوی ’’زندگی‘‘ فلم کے بارے میں منٹو کے نقطہ نظر سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں ’’اس مضمون میں منٹو کا شوخ اور کٹیلا اسلوب سان پر چڑھا ہوا ہے۔ اور اس میں فن اور زندگی دونوں کے متعلق منٹو کے چند بنیادی رویوں کا اظہار ہوتا ہے۔‘‘[۱۵] ’’زندگی‘‘ جسے خواجہ احمد عباس اور جلیل انصاری اچھی فلم قرار دیتے ہیں، دراصل جمود کا شکار ہے۔ منٹو نے اس فلم کو تیز و تند شراب کے بجائے سکنجبین کا گلاس قرار دیا ہے جسے اب نہ تو واپس کیا جاسکتا ہے اور نہ پھینکا جاسکتا ہے اب یہ کھٹ میٹھا شربت پینا ہی ہوگا اور بقول منٹو ’’کھٹ میٹھا شربت اگر اس میں کافی برف ڈالی گئی ہو، بد ذائقہ نہیں ہوتا۔‘‘ فلم کے نمایاں اداکاروں میں سہگل، جمنا اور بروا شامل تھے۔ منٹو کا خیال ہے کہ باکس آفس پر ایک فلم کی کامیابی کے لیے جو گُر ضروری ہوتے ہیں وہ سارے استعمال کیے گئے ہیں۔ منٹو کا خیال ہے کہ زندگی حرکت کا نام ہے مگر فلم ساز نے اسے جمود کا شکار کر رکھا ہے۔ فلم ’’زندگی‘‘ ہال میں بیٹھے افراد میں کوئی

حرکت پیدا نہیں کرتی۔ گویا زندگی کے روپ میں موت نظر آتی ہے۔ لیکن منٹو موت کو بھی متحرک سمجھتے ہیں۔ ذیل کا اقتباس دیکھیے:

میں مانتا ہوں کہ زندگی کا انجام موت ہے لیکن موت میں بھی تو زندگی ہے۔ موت مردہ تو نہیں ہوتی۔ وہ موت جو زندگی کو اپنے کھردرے ہاتھوں میں مسل دیتی ہے، جو رگِ حیات کو دبا کر اس کا پھڑکنا بند کر دیتی ہے، کیسے بے جان ہوسکتی ہے۔۔۔[۱۶]

کہانی لکھنے والا جب کسی ایک دُکھ کا احساس اپنے کرداروں سے فلم بینوں کو محسوس نہیں کرا سکتا تو وہ کرداروں کی زندگی کئی دکھوں سے مزین کر دیتا ہے تاکہ دیکھنے والوں کو کردار کے آلام کا احساس ہو سکے۔ مگر اس طرح ایک نقص پیدا ہوتا ہے اور فلم پر غیر ضروری بوجھ پڑتا ہے۔ بلکہ منٹو کے الفاظ میں اس فلم زندگی کے حوالے سے افسانہ نگار کی ذہنی اپچ کا اظہار یوں ہوتا ہے ''معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے ایک دلدل پر عمارت کھڑی کی ہے جو ہر اینٹ کے دباؤ سے نیچے دبی جاتی ہے۔'' ''زندگی'' کے افسانہ نگار نے کہیں ایسی کوئی کوشش نہیں کی کہ فنکار خود سے کوئی کوشش کر کے حالات بدلتے، وہ وقت کے رحم وکرم پر ہیں۔ گویا زندگی ،،زندگی سے بلکہ حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ حقیقت نگار کا کام کیا ہے؟ اسی جمود کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے منٹو، رتن لعل (سہگل) کے کردار کے حوالے سے سوال اٹھاتے ہیں کہ وہ فلم میں بے کار کیوں ہے؟ حالانکہ وہ سریلا ہے، گانے گا تا ہے، کچھ نہ کچھ تو کما سکتا ہے جبکہ اچھا گانے والوں کی ہر فلم کمپنی کو کمی کا سامنا ہے۔ منٹو مزید لکھتے ہیں:

ساری فلم دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ بے کار رہنا چاہتا تھا یا اسے زبردستی افسانہ نگار نے بے کار رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کا کینوس افسانہ نگار نے بہت ہی محدود کر دیا ہے۔۔۔ مگر اس فلم میں تو رتن لعل اور شریمتی ہیروئن اپنی کشتیوں کو الٹ کر اس کے پیندوں میں سوراخ بناتے رہے ہیں۔[۱۷]

منٹو نے خوبصورت اور بلیغ استعاروں کی مدد سے فلم میں رومانی، خود اذیتی، خود ترحمی اور خود کو برباد کرنے والے کرداروں کے رویے کو موضوع بنایا ہے۔ اس کے بعد منٹو فلم کے بنیادی خیال محبت کے جذبے کو موضوع بناتے ہیں۔ محبت زندگی میں کچھ کر گزرنے کی اکساہٹ پیدا کرتی ہے۔ یعنی ایک طرح سے محبت تحرک کا جذبہ ہے۔ لیکن فلم ''زندگی'' میں اس متحرک جذبے سے کوئی کام نہیں لیا جاتا۔

موجودہ ترقی یافتہ اور تجارتی دور میں منٹو نے کتنی درست بات کہی ہے کہ عورت اور مرد کا عشق فی زمانہ جنسی ہے۔ جدید معاشرتی زندگی نے انسانی اخلاقیات بدل کر رکھ دی ہیں۔ مرد اور عورت کے مابین فاصلے اس قدر گھٹ گئے ہیں کہ رومانوی محبت کرنے والوں کو جن رکاوٹوں کا سامنا ہوتا تھا وہ اب ختم ہو چکی ہیں بلکہ ایک طرح سے ہجر کی لذت ہی ختم ہوگئی ہے۔ کہانی کی ہیروئن جب شوہر کا گھر چھوڑتی ہے تو باہر ملنے والے پہلے شخص سے محبت کا اظہار کر دیتی ہے۔ دراصل یہ محبت نہیں تھی بلکہ جنسی بھوک تھی۔ بس وہ ایک مرد چاہتی تھی۔ لیکن اُسے وہ اپنا بنا لینے کی جرأت نہیں کرتی۔ یہاں منٹو اُس بنیادی سوال کی طرف آتے ہیں کہ اگر انہیں ایک دوسرے سے جنسی محبت تھی تو دونوں کے جنسی ملاپ میں پھر مانع امر کیا تھا؟ منٹو کا خیال ہے کہ سماج تو اُن کے اس فعل سے لاتعلق ہے۔ گویا مرد اور عورت کے مابین جنسی تعلقات فی زمانہ ایسی بات نہیں رہی کہ اس سے بھونچال آئے۔ سو اس موضوع کا عمومی زندگی سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ فلم میں افسانہ نگار نے کرداروں کو حالات کے جبر پر چھوڑ رکھا ہے۔ مثلاً سماج کے وہ قوانین جو کرداروں پر بوجھ بن چکے ہیں اور اُنھیں فلم میں زندگی دکھانے کے لیے توڑ دینا چاہیے، وہ اُنھیں نہیں توڑتے بلکہ سماج کو گالیاں دے کر چپ سادھ لی جاتی ہے۔ منٹو اس جمود کے خلاف ہیں۔

منٹو فلم جیسے جدید میڈیم سے فلم بینوں کو مستفید کرنا چاہتے ہیں۔محض تفریح جس کے کوئی معنی نہ ہوں اُن کا مطمع نظر کبھی نہیں رہا۔اس مضمون میں منٹو کہانی کے موضوعات اور فلم کی تکنیک پر اپنی مہارت کے ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ کردار سازی اور جزئیات نگاری کی افادیت سے آگاہ کرتے ہیں۔

فلم کی دنیا میں زندگی جس تصنع اور بناوٹ کا شکار ہوتی ہے منٹو اس سے بیزار نظر آتے ہیں۔ اُنہوں نے سٹیج پر فلم بنتے دیکھی تو اُن کی فطرت پسند طبعیت اوبنے لگی۔منٹو کی زندگی میں ریاکاری، تصنع ،فریب کا کوئی دخل نہیں اسی لیے ان کا کہنا ہے کہ وہ اب فلم نہیں دیکھتے حالانکہ اس سے قبل منٹو یہ اظہار کر چکے ہیں کہ عوام کو تعلیم یافتہ بنانے میں فلم ایک موئثر کردار ادا کرسکتی ہے ۔منٹو جو کئی برس سے فلمی اداروں سے پیسے کما رہے ہیں، فلموں کی کہانیاں اور مکالمے لکھنے والا منٹو،اس سب سے بڑھ کر ہندوستانی فلم کا اچھا پارکھ اور فلم کی تکنیک کے ماہر کا جی کیوں اچاٹ ہوا اور اُنہوں نے فلمیں دیکھنی کیوں ترک کیں۔ ''میں آپ سے سچ سچ عرض کرتا ہوں۔۔۔ بناوٹ اور صرف بناوٹ نے میرا دل کھٹا کیا۔مرتے وقت کلمہ نصیب نہ ہو۔یہی وجہ ہے کہ میں آج بالکل فلم نہیں دیکھتا۔''[۱۸]

فلم میں وہ کیا بناوٹ ہے جس نے فلم کے ایک اچھے نقاد کو فلم سے دور کر دیا ہے؟منٹو کی تحریروں میں موجود مزاح کی چاشنی کا لطف اس مضمون میں بھی موجود ہے۔فلم نہ دیکھنے کی وجوہات گو کہ سنجیدہ ہیں مگر اُن کی تہہ میں رواں دواں مزاح اُن کی اثر انگیزی کو بڑھا دیتا ہے۔فلم بنانے اور پردہ ٔ سکرین پر پیش کرنے تک ایسے کئی مناظر ہوتے ہیں جو ہوتے تو کچھ اور ہیں مگر بظاہر نظر کچھ اور آتے ہیں۔فلم میں ہر طرف بناوٹ ہے، نقل ہے۔جو دیکھا جا رہا ہے وہ ہے نہیں اور جو ہے وہ دکھائی نہیں دیتا۔ایسے ہی کئی مناظر ہیں جنھیں فلم بین ہال میں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں یا غمگین ہوتے ہیں۔منٹو اس سارے عمل کو فریب قرار دیتے ہیں اُن کا کہنا ہے''کتنا بڑا فریب ہے یہ فلم کہ خود فریب ساز بھی فریب کھا جاتے ہیں۔''[۱۹] منٹو کے مضامین کے عمومی موضوعات سیاسی سماجی معاشرتی ادبی اور فلمی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ان مضامین میں منٹو نے مختلف موضوعات پر اپنے خیالات اور نظریات کا بے لاگ اظہار کیا ہے۔ ان مضامین کی فضا طنز آمیز مزاح سے عبارت ہے۔منٹو اپنے خیالات ونظریات کے اظہار میں بے باک اور نڈر ہیں۔منٹو کے مضامین میں افسانوی انداز، تمثیلی آہنگ اور اظہار میں قطعیت نمایاں ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ برج پریمی،ڈاکٹر،منٹو کتھا،دیپ پبلی کیشنز جموں،۱۹۹۴ء،ص ۱۸۵

۲۔ منٹو،سعادت حسن،منٹو نما (کلیات)،سنگ میل پبلیکیشنز لاہور،۲۰۰۳ء،ص ۵۹۳

۳۔ ایضاً،ص ۵۹۴

۴۔ ایضاً،ص ۵۹۵

۵۔ ایضاً،ص ۵۹۴

۶۔ ایضاً،ص ۵۹۵

۷۔ ایضاً، ۵۹۵

۸۔ منٹو،سعادت حسن، منٹونما (کلیات)،سنگ میل پبلیکیشنز لاہور،۲۰۰۳ء، ص۵۹۶

۹۔ ایضاً،ص۵۹۸

۱۰۔ ایضاً،ص۶۰۰

۱۱۔ ایضاً،ص۶۰۲

۱۲۔ ایضاً،ص۶۰۵

۱۳۔ برج پریمی، ڈاکٹر،منٹو کتھا، دیپ پبلی کیشنز جموں،۱۹۹۴ء،ص۱۹۵

۱۴۔ ایضاً،ص۵۹۰

۱۵۔ وارث علوی،منٹو: ایک مطالعہ، وجے پبلشرز، گولا مارکیٹ دریا گنج دہلی، ۱۹۹۷ء،ص۱۲

۱۶۔ منٹو،سعادت حسن، منٹونما (کلیات)،سنگ میل پبلیکیشنز لاہور،۲۰۰۳ء،ص۶۱۹

۱۷۔ ایضاً، ۶۲۰

۱۸۔ منٹو،سعادت حسن، منٹونما (کلیات)،سنگ میل پبلیکیشنز لاہور،۲۰۰۳ء،ص۶۲۴

۱۹۔ ایضاً،ص۴۲۱